۲۸

ہم کس حد تک دُنیوی عزت کے طالب ہو سکتے ہیں قربانیاں اور مصائب وہ کھڑکیاں ہیں جن میں سے ہم اپنے محبوب کو جھانک سکتے ہیں

(فرمودہ ۳۱؍جولائی ۱۹۳۶ء بمقام دھرم سالہ)

تشہد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:-

اس زمانہ میں ہماری جماعت کے خلاف طرح طرح کے منصوبے اور شرارتیں کی جاتی ہیں اور دشمن ہم کو ہر قسم کی تکلیف پہنچانے کے درپے ہیں۔ اس موقع پر ہماری جماعت کو سورۂ فاتحہ کے مضامین پر غور کرنا چاہیئے۔ سورۂ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ مؤمن عزت کا طالب ہوتا ہے اور یہ کوئی بُری بات نہیں اور وہ ذلّت سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ بھی کوئی بُری بات نہیں۔ اگر یہ باتیں یعنی طلبِ عزت اور ذلّت سے احتراز کی کوشش بُری ہوتیں تو یہ کس طرح ہوسکتا تھا کہ خدا تعالیٰ خود ہم کو ان کی طرف سورۂ فاتحہ میں توجہ دلاتا۔ اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ بندہ کچھ تو خدا تعالیٰ سے انعام مانگتا ہے اور کچھ باتیں ایسی ہیں جن سے محفوظ رہنے کی التجا کرتا ہے۔ پس اگر عزت کی طلب اور ذلّت سے بچنے کی سعی بُری بات ہے تو ہم کو خدا تعالیٰ ہرگز ایسی دعا نہ سکھلاتا جس میں یہ دونوں باتیں ہوں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے ہم کو ایسی دعا

سکھلائی ہے اور وہ دعا ہر نماز میں کرنے کا حکم دیتا ہے۔ یعنی یہ کہ اپنے لئے عزت مانگو اور ذلّت سے بچنے کی کوشش کرو اور یہ تقاضا ایک طبعی تقاضا ہی نہیں بلکہ مذہبی اور روحانی تقاضا ہے۔ اور اس حد تک بندہ مجرم نہیں ٹھہرتا بلکہ خدا تعالیٰ کے منشاء کو پورا کرنے والا اور اُس کی رضا کا طالب قرار پائے گا۔ پس ان خطرات کے ایام میں اگر ہماری جماعت کے دوست عزت کے طالب اور ذلت سے محفوظ رہنے کے خواہشمند ہوں تو یہ کوئی بُری بات نہیں اس حد تک کہ وہ عزت کے طالب ہوں اور ذلّت سے بچنے کی سعی کریں۔ خدا تعالیٰ بھی ان کی خواہش کو جائز قرار دے گا اور اس کا رسول بھی مگر یہاں ایک اختلاف پیدا ہوسکتا ہے جو نظر انداز کئے جانے کے قابل نہیں اور وہ اس بات کے سمجھنے میں ہے کہ عزت کیا چیز ہے اور ذلّت کیا ہے؟ اور کس رنگ میں مؤمن عزت کا طالب اور ذلّت سے بچنے کا خواہشمند ہو تو اس کا یہ کام قابلِ اعتراض نہیں۔ اور وہ کونسی صورت ہے کہ جب اس کا طالب عزت ہونا اور ذلت سے بچنے میں کوشاں ہونا قابلِ اعتراض ہو جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے جہاں مؤمن کو اس طرف توجہ دلائی ہے کہ وہ عزت کا طالب ہو اور ذلّت سے بچنے کا خواہشمند ہو وہاں خود ہی عزت اور ذلّت کی وضاحت بھی فرما دی ہے۔ پس خدا تعالیٰ کی بیان کردہ طلب تو بہتر اور منشائے الٰہی کو پورا کرنے والی ہوگی لیکن اگر ہم عزت کا مفہوم بدل دیں اور اپنی طرف سے کوئی عزت ٹھہرا لیں اور پھر اُس کے طالب ہوں تو ہم مجرم ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ نے سورہ فاتحہ میں عزت کا مفہوم یہ بیان فرمایا ہے کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ [۱] یعنی ہم کو ان لوگوں کا سیدھا راستہ دکھا جن پر تیرا انعام ہوُا۔ وہ منعم علیہم لوگ کون تھے؟ ان کے بارہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا [۲]۔ پس جو بندہ نبیوں اور صدیقوں اور شہیدوں اور صالحین والا انعام پانے کی جستجو کرتا اور نیکیوں اور تقویٰ کا طالب بنتا ہے وہ ہرگز جاہ کا طالب اور دین پر دنیا کو مقدم کرنے والا نہ سمجھا جائے گا بلکہ قرآن مجید کی رو سے وہ بندہ فرضِ الٰہی کو پورا کرنے والا اور منشائے الٰہی پر عمل کرنے والا سمجھا جائے گا کیونکہ وہ ان سب انعامات کو طلب کر رہا ہے جو انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کو ملے اور ان انعامات کی طلب جو ان لوگوں کو ملے عین منشائے الٰہی بلکہ حکمِ الٰہی

کے مطابق ہے۔

میں اِس وقت اس بحث میں نہیں جاؤں گا کہ نبوت، صدیقیت، شہادت، صالحیت کی تشریحات کیا ہیں؟ ہم نے صرف یہ دیکھنا ہے کہ ہم کس حد تک عزت کے طالب ہو سکتے ہیں؟ اِس وقت میں یہ حصہ لیتا ہوں کہ انبیاء کو جو انعامات ملے وہ دُنیوی لحاظ سے ان کو کیا پوزیشن دیتے ہیں اور صدیقین کو جو انعامات ملے وہ اُن کو دنیاوی لحاظ سے کیا پوزیشن دیتے ہیں اور شہداء اور صالحین کو جو انعامات ملے وہ دنیاوی لحاظ سے ان کو کیا پوزیشن دیتے ہیں۔ پہلے انبیاء کو لو اور دیکھو کہ نبوت کا انعام کس حد تک اُن کو دُنیوی مراتب عطا کرتا ہے۔ اس حد تک ہمارے لئے بھی جائز ہوگا کہ ہم دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو یہ مراتب بخشے۔ نبی کریم ﷺ اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو دیکھو جس حد تک ان کے دنیا سے تعلقات تھے اُس حد تک جاہ کی طلب ہمارے لئے جائز ہے اور جس جگہ پر جا کر وہ کھڑے ہو جاتے ہیں اس سے آگے بڑھنا ہمارے لئے جائز نہ ہوگا۔ ان انبیاء میں سے بعض بادشاہ بھی تھے۔ مثلاً حضرت نبی کریم ﷺ، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام وغیرہ۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام۔ حضرت آدم علیہ السلام کو بھی ایک حد تک تنفیذِ امر کا مقام حاصل تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایسی حکومت حاصل نہ سہی لیکن کم از کم اپنے قبیلہ میں وہ ضرور حکومت کرتے تھے۔ غرض بادشاہت کا ثبوت بعض انبیاء میں ضرور ملتا ہے اور یہ بات تاریخ سے بھی ثابت ہے اس کے حصول اور قیام کیلئے کس حد تک انہوں نے دین کو تابع کیا ہے اس کی مثال ہمارے سامنے آنحضرت ﷺ کے وجود مبارک میں موجود ہے۔ حضور آخری عمر میں ایک بادشاہ تھے اس میں کسی کو شک نہیں ہو سکتا لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس بادشاہت سے حضور نے دنیاوی فوائد کیا حاصل کئے ہیں۔ مثلاً بیوی بچوں کی آسائش، دوستوں کی آسائش اور رشتہ داروں کی آسائش اس بادشاہت سے حضور نے کہاں تک حاصل کی۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور نے اِس بادشاہت سے دنیاوی فائدہ کوئی بھی حاصل نہیں کیا بلکہ حضورؐ نے اپنی تمام تر زندگی میں لوگوں کیلئے قربانی ہی پیش کی۔ حضور نے ممالکِ مفتوحہ اور جائدادوں کو اپنا ہرگز قرار نہیں دیا۔ حضور کی وفات کے بعد سنّی شیعہ کا جو اختلاف پیدا ہوا اس عظیم الشان اختلاف کی بنیاد ہی اس بات پر ہے کہ حضور نے جائدادوں اور ممالکِ مفتوحہ کو اپنی

ذاتی چیز اور ملکیت قرار نہیں دیا اور یہ جائز نہیں ٹھہرایا کہ یہ اشیاء حضور کے خاندان کی طرف بطور ورثہ کے منتقل ہوسکیں۔ پس حکومت سے حضور نے اپنی ذات کیلئے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا۔ حضور کی اولاد کے بارہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ حضور نے ان کیلئے کوئی چیز بھی دنیا میں نہیں چھوڑی۔ حتّٰی کہ حضور کی وفات کے وقت حضور کی بہت سی اشیاء گرو رکھی ہوئی ثابت ہوئیں۔ انسان کو اپنی زندگی میں بعض اوقات ایسی ضروریات پیش آجاتی ہیں کہ اسے اپنی مملوکہ اشیاء گرو رکھنی پڑتی ہیں اسی طرح حضور پر بھی تنگی اور فراخی کے زمانے آتے رہتے تھے۔ خود حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بارہ میں آتا ہے کہ ایک جنگ میں جب بہت سا مال آیا تو حضرت فاطمہ نے حضور سے درخواست کی کہ اس مال میں سے ایک لونڈی مجھے عنایت فرمائی جائے جو میرا کام کاج کرے۔ حضورؐ نے حضرت فاطمہؓ سے فرمایا کہ یہ مال میرا تو نہیں ہے یہ تو خدا تعالیٰ کا ہے۔ میں تم کو اس مال میں سے کچھ نہیں دے سکتا تم خدا تعالیٰ کا ذکر کیا کرو اور لونڈی کا خیال ترک کردو[۳]۔

پھر حضور کے دوستوں کو لو۔ رسول کریم ﷺ کے دوست ایسے لوگ تھے جنہوں نے حضور کی بہت خدمات کیں لیکن حضورؐ نے ان سے کوئی ایسا سلوک نہیں کیا جن میں دوسرے لوگوں پر ان کو ترجیح دی گئی ہو۔ حضرت عباسؓ حضور کے چچا بھی تھے اور دوست بھی کیونکہ عمر میں برابر کے تھے ان کے تعلقات حضور سے اس قدر اہم تھے کہ جب کچھ لوگ مدینہ منورہ کے مسلمانوں میں سے حج کرنے آئے اور انہوں نے چاہا کہ حضور کو اپنے ساتھ مدینہ لے چلیں تا کہ حضور مکہ کی تکالیف سے محفوظ ہو جاویں۔ اُس وقت حضور نے ان کی ملاقات کیلئے صرف حضرت عباسؓ کو اپنے ساتھ لیا اور معاہدہ بھی ان کی منشاء کے مطابق کیا۔ یہی حضرت عباسؓ جب بدر کی جنگ میں مسلمان ہونے سے پہلے قید ہوئے تو حضورؐ نے ان کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا۔ جس طرح باقی قیدیوں کو رسیوں میں جکڑا گیا اسی طرح اِن کو جکڑا گیا اور بوجہ رفاہیت کی زندگی کی عادت کے ان کو کئی دوسرے قیدیوں سے زیادہ تکلیف پہنچی اور وہ شدتِ درد سے کراہتے رہے۔ چنانچہ بعض صحابہؓ نے رات کے وقت حضور علیہ السلام کو دیکھا کہ آپ بار بار کروٹیں بدل رہے ہیں اور آپ کو بے چینی کی تکلیف معلوم دیتی ہے۔ اس پر بعض صحابہ نے عرض کی کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضور کو نیند نہیں آرہی اور کچھ بے چینی سی ہے۔ حضور نے فرمایا ہاں میں بے چین ہوں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ شاید عباسؓ

کی رسیاں زیادہ سخت باندھی گئی ہیں کیونکہ وہ کراہ رہے ہیں ان کی تکلیف کو دیکھ کر مجھے بے چینی محسوس ہورہی ہے اور میں سو نہیں سکتا۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ حضور! یہ تو معمولی بات ہے ہم اِسی وقت حضرت عباسؓ کی رسیاں ڈھیلی کر دیتے ہیں۔ حضور نے فرمایا نہیں، یا تو سب قیدیوں کی رسیاں ڈھیلی کر دی جائیں ورنہ عباسؓ کی رسیاں بھی اسی طرح رہنے دی جائیں۔ چنانچہ حضرت عباسؓ اور باقی تمام قیدیوں کی رسیاں ڈھیلی کر دی گئیں ۴؎ اور حضرت عباسؓ کو آرام مل گیا تب حضور آرام کی نیند سوئے۔ پس بادشاہت سے حضور نے یا حضور کے دوستوں اور رشتہ داروں نے قطعاً کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا۔ وہ بادشاہت تو خدا تعالیٰ کیلئے تھی اور اس بادشاہت میں آپ کو ویسی ہی انفرادی عزت حاصل تھی جیسی اور لوگوں کو تھی۔

یاد رکھنا چاہئے ذاتی عزت اور حکومت کی عزت میں فرق ہوتا ہے۔ بعض لوگ حکومت اور انفرادی عزت میں فرق نہیں کر سکتے اس لئے حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ حکومت کے بارہ میں آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ وَمَنْ اَطَاعَ اَمِیْرِیْ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ وَمَنْ عَصٰی اَمِیْرِیْ فَقَدْ عَصَانِیْ ۵؎ کہ جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی اطاع کی اس نے گویا میری اطاعت کی اور جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی نافرمانی کی اس نے گویا میری نافرمانی کی۔ گویا نظام کے ماتحت جو حکومت آپکو حاصل تھی اُس میں نہ صرف اپنے لئے بلکہ اپنے مقرر کردہ امیروں کیلئے بھی آپ کُلّی اطاعت کے طالب ہیں لیکن جہاں ذات کا سوال آتا ہے وہاں اپنے یا اپنے عزیزوں کیلئے کوئی زائد فائدہ طلب نہیں فرماتے۔ پس حاکمانہ مرتبہ اور چیز ہے اور انفرادی عزت اور چیز ہے۔ بھلا اس اطاعت سے حضور کو کیا جسمانی فائدہ ہوسکتا تھا ہاں اس سے خدا تعالیٰ کی حکومت ضرور قائم ہوتی تھی۔ لوگ ایسی حکومت کو ذاتی عزت خیال کر لیتے ہیں حالانکہ ذاتی عزت اور ذاتی فائدہ تو یہ ہے کہ کوئی شخص حکومت کو اپنے آرام و آسائش میں استعمال کرے۔ مثلاً جاگیریں حاصل کرے یا مال جمع کرے وغیرہ۔ لیکن حضور نے اس حکومت سے ایسا فائدہ ہرگز حاصل نہیں کیا بلکہ وہ تو حج، زکوٰۃ اور قربانیوں کیلئے لوگوں کو دعوت دیتے تھے۔ پس وہ بڑائی جو نظام کیلئے ہو وہ ذاتی بڑائی نہیں بلکہ ایسی بڑائی تو خدا تعالیٰ کی حکومت قائم کرنے کیلئے ضروری ہے۔ پس جب یہ ارشاد ہوا کہ تم لوگ نبیوں والے انعام مانگو تو اس سے یہ مراد نہیں کہ ہم کو ایسی حکومت ملے جس میں ہماری ذات،

اولاد، دوستوں اور رشتہ داروں کو دنیاوی فوائد حاصل ہوں بلکہ اس انعام سے مراد وہ قربانیاں اور تکالیف ہیں جو انبیاء کو اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے میں اُٹھانی پڑتی ہیں اور یہی وہ انعام ہے جس کے مانگنے کیلئے اللہ تعالیٰ ہم کو حکم فرماتا ہے۔

نبیوں کے بعد صدیقوں کا مقام ہے۔ صدیقوں میں سے حضرت ابوبکرؓ کی ذات ہمارے سامنے ہے۔ ہم آپ کی ذات کا مشاہدہ کر کے معلوم کرتے ہیں کہ کیا صدیقیت کے مقام میں کسی قسم کی ذاتی بڑائی مدنظر ہوتی ہے؟ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا اعلیٰ مقام خلافت تھا ہم دیکھتے ہیں کہ کیا اس صدیق نے اس مقام کو ذاتی بڑائی کا ذریعہ بنایا؟ اس حقیقت کو معلوم کرنے کیلئے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاً بعد کا ایک واقعہ لیتا ہوں۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سوائے چند علاقوں کے تمام عرب میں بغاوت پھیل گئی اور اس موقع پر حضرت عمرؓ جیسے صحابی بھی خوفزدہ ہوگئے اور انہوں نے اور دوسرے صحابہؓ نے یہ مشورہ کیا کہ ان باغیوں سے رعایت کی جائے اور زکوٰۃ کے لینے میں ان سے نرمی اختیار کی جائے۔ دوسرے یہ کہ وہ لشکر جو اسامہؓ کے ماتحت حضورؐ نے عیسائیوں سے لڑنے کیلئے بھیجا تھا اُس کو روک لیا جائے اور اس لشکر سے موجودہ بغاوت کے دبانے میں مدد لی جائے۔ یہ مشورہ کر کے حضرت عمرؓ، حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئے اور اُن سے جا کر یہ دونوں باتیں کہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا کہ ایک مشورہ آپ کا یہ ہے کہ جیشِ اسامہ کو روک لوں، میرا جواب اس بارہ میں یہ ہے کہ کیا ابن قحافہ کی یہ طاقت ہے کہ وہ اُس لشکر کو جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا تھا روک لے؟ یہ لشکر ضرور جائے گا خواہ کفار کا لشکر مدینہ میں گھس آئے اور خواہ مدینہ کی عورتوں کی لاشیں گلیوں میں پھینک دی جائیں [۶]۔ باقی رہا زکوٰۃ کے مطالبہ میں نرمی اختیار کرنا تو زکوٰۃ تو خدا تعالیٰ کا حکم ہے اگر لوگ اونٹ کی وہ رسی تک جس سے اونٹ کا گھٹنا باندھتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دیا کرتے تھے اب دینے سے انکار کریں گے تو میں ان سے جنگ کروں گا [۷]۔ یہ بات بتاتی ہے کہ وہ ہر عزت خدا اور اس کے رسول کیلئے سمجھتے تھے اپنے لئے انہیں کسی امر کی خواہش نہ تھی۔

ان کی زندگی میں ایک اور مثال بھی نظر آتی ہے حضرت ابوبکرؓ کے بیٹے عبدالرحمٰن بھی خلافت کے لائق تھے اور لوگوں نے کہا بھی کہ ان کی طبیعت حضرت عمرؓ سے نرم ہے اور لیاقت بھی

ان سے کم نہیں ان کو آپ کے بعد خلیفہ بننا چاہئے لیکن حضرت ابوبکرؓ نے خلافت کیلئے حضرت عمرؓ کو ہی منتخب کیا۸؎ باجودیکہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی طبائع میں اختلاف تھا۔ پس حضرت ابوبکرؓ نے خلافت سے ذاتی فائدہ کوئی حاصل نہیں کیا بلکہ آپ خدمتِ خلق میں ہی بڑائی خیال کیا کرتے تھے۔

صوفیاء کی ایک روایت ہے (وَاللّٰہُ اَعۡلَمُ کہاں تک درست ہے) کہ حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے غلام سے پوچھا کہ وہ کون کون سے نیک کام تھے جو تیرا آقا کیا کرتا تھا تاکہ میں بھی وہ کام کروں۔ منجملہ اور نیک کاموں کے اس غلام نے ایک کام یہ بتایا کہ روزانہ حضرت ابوبکرؓ روٹی لے کر فلاں طرف جایا کرتے تھے اور مجھے ایک جگہ کھڑا کر کے آگے چلے جاتے تھے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ کس مقصد کیلئے اُدھر جاتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ اس غلام کے ہمراہ اُس طرف کو کھانا لے کر چلے گئے جس کا ذکر غلام نے کیا تھا۔ آگے جا کر کیا دیکھتے ہیں کہ ایک غار میں ایک اپاہج اندھا جس کے ہاتھ پاؤں نہ تھے بیٹھا ہوا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اُس اپاہج کے منہ میں ایک لقمہ ڈالا تو وہ رو پڑا اور کہنے لگا اللہ تعالیٰ ابوبکرؓ پر رحم فرمائے وہ بھی کیا نیک آدمی تھا۔ حضرت عمرؓ نے کہا بابا! تجھے کس طرح پتہ چلا کہ ابوبکرؓ فوت ہوگئے ہیں؟ اس نے کہا کہ میرے منہ میں دانت نہیں ہیں اس لئے ابوبکرؓ میرے منہ میں لقمہ چبا کر ڈالا کرتے تھے آج جو میرے منہ میں سخت لقمہ آیا تو میں نے خیال کیا کہ یہ لقمہ کھلانے والا ابوبکرؓ نہیں ہے بلکہ کوئی اور شخص ہے اور ابوبکرؓ تو ناغہ بھی کبھی نہ کیا کرتے تھے اب جو ناغہ ہوا تو یقیناً وہ دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ پس وہ کونسی شے ہے جو بادشاہت سے حضرت ابوبکرؓ نے حاصل کی؟ کیا سرکاری مال کو اپنا قرار دیا اور حکومت کی جائدادوں کو اپنا مال قرار دیا؟ ہرگز نہیں۔ جو اشیاء ان کے رشتہ داروں کو ملیں وہ ان کی ذاتی جائداد سے تھیں۔

اب شہداء کو لو۔ شہید وہ ہے جو خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنی جان قربان کر دیتا ہے۔ پس جب خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ شہیدوں والا انعام مانگو تو یقیناً اس کا یہ مطلب ہوا کہ ہم کو یہ حکم دیا جارہا ہے کہ تم خدا تعالیٰ سے یہ دعا مانگو کہ اے خدا! ہم تیرے راستہ میں مارے جائیں اور غور کرو کہ بھلا مارے جانے والے کو دنیاوی فائدہ کیا پہنچ سکتا ہے۔ موت اور دنیاوی فائدہ کس طرح جمع ہو سکتے

ہیں۔معلوم ہوا کہ شہیدوں والا انعام لینے کیلئے بھی انسان کو اپنے پاس سے کچھ دینا ہی پڑتا ہے یعنی اپنی جان دینی پڑتی ہے تب رضائے الٰہی حاصل ہوتی ہے۔

آگے فرمایا وَالصّٰلِحِیۡنَ۔ صالح کے معنے نیک کے ہیں۔ صالحین والا انعام نیکی کی توفیق کا مل جانا ہوا۔ قرآن مجید نے نیک کام یہ نہیں بتلائے کہ ہم کو دنیا کے لوگوں کی نظروں میں عزت مل جائے، لوگ ہم کو گالیاں نہ دیں، لوگ ہماری بات سنیں بلکہ اللہ تعالیٰ تو نیک اُن لوگوں کو قرار دیتا ہے جو مِمَّا رَزَقۡنٰھُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ [9] پر عمل کرنے والے، خدمتِ خلق کرنے والے، نماز، روزہ، زکوٰۃ کے پابند اور غرباء مساکین کی مدد کرنے والے ہوں۔

پس یہی دعا ہے جو ہم سے منگوائی گئی ہے اور یہی انعام ہے جس کے مانگنے کا ہم کو حکم دیا گیا ہے یعنی یہ کہ ہم کو نیکیوں کے کرنے کی توفیق مل جائے جو انبیاء، صدیقین اور صالحین کرتے رہے۔ انبیاء خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچانے کیلئے اپنا سب کچھ قربان کر دیتے ہیں۔ پس جو انبیاء کے انعامات کا طالب ہے یقیناً اس کو تکالیف اور مصائب برداشت کرنی پڑیں گی۔ اسی طرح صدیق اُس کو کہتے ہیں جو نبی کے نقشِ قدم پر چلے اور نبی کی طرح خدا تعالیٰ کا پیغام لوگوں تک پہنچائے تو صدیقوں والے انعام کے طالبوں کو بھی انبیاء کی طرح تکالیف اُٹھانی اور قربانیاں کرنی پڑیں گی۔ شہید اُس کو کہتے ہیں جو خدا کی راہ میں اپنی جان دے۔ پس وہ بھی کچھ دیتا ہی ہے یعنی لیتا نہیں۔ اسی طرح صالح وہ ہے جو احکام الٰہیہ پر عمل کرے نہ کہ جاگیردار ہو یا کسی مجلس کا پریذیڈنٹ یا مالدار ہو بلکہ قرآن مجید کے نزدیک نیک وہ ہے جو لوگوں کی خبر گیری کرے۔ ذاتی بڑائی کا اُس کو خیال نہ ہو اور خدمتِ خلق پر اس نے کمر باندھ رکھی ہو۔ ان تمام باتوں کے بعد انسان کو ملتا کیا ہے۔ فرمایا اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ [10]۔ یعنی یہ کہ خواہ نبوت کے ذریعہ سے جستجو کرو خواہ صدیقیت اور شہادت اور صالحیت کے ذریعہ سے ہر رنگ میں تمہاری جستجو عبودیت کیلئے ہونی چاہیئے یعنی عبودیت کی چادر کا مِل جانا ہی حقیقی انعام ہے۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے عبودیت کی چادر کے مل جانے کے بعد انسان کو دنیاوی انعام بھی مل جاتے ہیں مگر وہ ضمنی انعام ہیں اصل نہیں اصل تو صرف عبودیت کا حصول ہے۔ حکومت کا مِل جانا یا عزت کا حاصل ہو جانا تو ضمنی اور غیر مقصود اشیاء ہیں۔

یہاں تک تو یہ بتلایا گیا ہے کہ انسان کو خدا تعالیٰ سے کیا مانگنا چاہئے؟ آگے یہ فرماتا ہے کہ کن باتوں سے محفوظ رہنے کی انسان کو دُعا اور خواہش کرنی چاہئے اور وہ کونسی ذلّت ہے جس سے بچے رہنے کا خواہشمند ہونا ضروری ہے؟ فرمایا غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡھِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ [11] یعنی ذلّت اس کا نام نہیں کہ لوگ ہم کو گالیاں نہ دیں، ہمارا بائیکاٹ نہ کریں، ہمارا لین دین بند نہ کر دیں بلکہ حقیقی ذلّت یہ ہے کہ انسان کو خدا تعالیٰ بھول جائے جس کا غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡھِمۡ میں ذکر ہے یا انسان اللہ تعالیٰ کو چھوڑ دے جس کا وَلَا الضَّآلِّیۡنَ میں ذکر ہے۔ پس فرمایا کہ تم یہ دعا مانگو کہ اے خدا! تُو ہم کو اپنے دربار سے نہ نکال اور ہم کو اس سے محفوظ رکھ کہ ہم تجھ کو چھوڑ کر کسی اور طرف چل دیں۔ پس اس ذلت سے بچنے کی اگر ہم دعا کریں تو ہم پر ہرگز کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا کیونکہ جب خود خدا تعالیٰ نے اس ذلت سے بچنے کا حکم فرمایا ہے تو پھر اعتراض کے کیا معنی؟ پس قرآن مجید کی بیان کردہ عزت اور ذلت تو یہ ہے کہ جس کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ اگر ہم اس عزت اور ذلت کے خلاف کوئی اور عزت اور ذلت ٹھہرالیں اور اس عزت کے طالب اور اس ذلت سے بچنے کی کوشش کریں تو ہم اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والے ہوں گے۔

مولوی برہان الدین صاحبؓ جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے مخلص صحابہ میں سے تھے اور مدرسہ احمدیہ مولوی برہان الدین صاحب اور مولوی عبدالکریم صاحب کی یادگار کے طور پر بنا ہے تاکہ اس مدرسے سے ایسے عالم پیدا کئے جائیں جو ان کی کمی پوری کرسکیں اور ان کے جانشین بن سکیں۔ اس سے ان کا احمدیت میں مقام معلوم ہوسکتا ہے۔ اُن کے متعلق میں ایک واقعہ سنا کر بتانا چاہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کے نیک بندے ذلت اور عزت کا کیا مفہوم لیتے ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام جب ۱۹۰۲ء میں یا ۱۹۰۳ء میں سیالکوٹ تشریف لے گئے تو غیر احمدیوں میں سے بعض نے شورش کرنے کا ارادہ کیا مگر اللہ تعالیٰ کا منشاء تھا کہ وہاں حضور کو کوئی تکلیف نہ ہو اس لئے اُس نے یہ انتظام کر دیا کہ شہر کے ایک رئیس آغا باقر جو قادیان برائے علاج آچکے تھے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے عقیدت رکھتے تھے ڈپٹی کمشنر نے انتظام کیلئے ان سے مشورہ کیا۔ انہوں نے اپنی خدمات انتظام کیلئے پیش کر دیں اور ساتھ مسٹر بیٹی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کو لگائے جانے کی خواہش کی اور ڈپٹی کمشنر نے اسے منظور کرلیا۔ چنانچہ ان دونوں نے مل کر

ایسا عمدہ انتظام کیا کہ کسی قسم کی شورش نہ ہوئی۔ لوگ پتھروں کو لے کر مکانوں پر چڑھے ہوئے تھے مگران دونوں نے کہہ دیا کہ اگر کسی نے شرارت کی تو ہم اُسے اِس قدر سزا دیں گے کہ وہ یاد رکھے گا یہ سن کر سب دشمن ڈر گئے۔ مجھے یاد ہے کہ جب بھی حضرت مسیح موعود علیہ السلام باہر نکلتے وہ ساتھ رہتے۔ اس سفر میں ایک لیکچر بھی حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے دیا اور کچھ لوگوں نے اس میں شورش کرنی چاہی اور بعض آنے والوں پر پتھر پھینکے۔ مسٹر بیٹی نے ان لوگوں کو ڈانٹ کر ہٹا دیا اور جب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا لیکچر ختم ہو چکا تو بآوازِ بلند کہا کہ مجھے ان مسلمانوں پر افسوس آتا ہے کہ غصہ تو ہم کو آنا چاہئے تھا کہ انہوں نے اپنے لیکچر میں ہمارے خدا کو مُردہ ثابت کیا ہے اور ہمارے خلاف اور بہت سی باتیں کہی ہیں لیکن مسلمانوں کے نبی کی بہت تعریف کی ہے اور وہ پھر بھی فساد کرتے ہیں۔ غرض اللہ تعالیٰ نے آپ کو سیالکوٹ میں ہر شر سے محفوظ رکھا اور اس سے دشمن اور بھی زیادہ غصہ میں بھر گئے۔ چنانچہ انہوں نے آخر تجویز کی کہ آپ کی واپسی پر ٹرین پر پتھر برسائے جائیں اور جو لوگ چھوڑنے جائیں واپسی کے وقت ان کو دکھ دیا جائے۔ چنانچہ جب حضرت مسیح موعود علیہ السلام واپس ہوئے تو آپ کی گاڑی پر پتھر برسائے گئے اور جو لوگ وداع کیلئے گئے تھے واپسی پر اُن پر حملہ کیا گیا۔ ان لوگوں میں مولوی برہان الدین صاحب مرحوم بھی شامل تھے۔ لوگ بُری طرح ان کے پیچھے پڑ گئے ستر یا بہتر سال ان کی عمر تھی اور نہایت کمزور تھے مگر خندہ پیشانی سے مار کھائی حتّٰی کہ ایک شخص نے گوبر اٹھایا اور ان کے منہ میں ڈال دیا۔ بعض دوستوں نے سنایا کہ مولوی صاحب اُس وقت بالکل غمگین نہ تھے بلکہ بہت خوش تھے اور بار بار کہتے تھے **"ایہہ نعمتاں کتھوں۔ ایہہ نعمتاں کتھوں"** یعنی یہ نعمتیں ہم کو پھر کب میسر آ سکتی ہیں؟ گویا مأمور کی خدمت میں مار کھانے کے مواقع روز روز حاصل نہیں ہوا کرتے۔ دیکھو! جس چیز کو لوگ ذلت خیال کرتے ہیں اُس کو مولوی صاحب نے عین عزت خیال کیا اور یہی قرآنی منشاء ہے۔ قرآن مجید کے نزدیک ذلت یہ نہیں کہ لوگ ہم کو گالیاں دیں کیونکہ گالیاں تو آنحضرت ﷺ کو بھی دی گئیں، حضور پر اوجھڑی بھی پھینکی گئی تو کیا گالیاں دی جانے اور اوجھڑی پھینکے جانے سے حضور کی ذلت ہوئی؟ ہرگز نہیں۔ حضور کا نام ہی محمدؐ ہے جس کے معنی عزت دیا گیا کے ہیں۔ پس جو واقعہ بھی حضور سے گزرا وہ یقیناً سراسر عزت ہے۔ اگر یہ بات نہیں تو خدا تعالیٰ جھوٹا ٹھہرتا ہے کیونکہ اس کے

یہ معنے ہوں گے کہ ایک طرف تو خدا تعالیٰ حضور کو محمد کہتا ہے اور دوسری طرف نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ ذلیل ہونے دیتا ہے۔ پس اگر گالیوں کا ملنا ذلّت ہے تو یہ ہرگز آنحضرت ﷺ کو نہ دی جاسکتیں۔ ہاں ایک فرق ضرور ہے اور وہ یہ کہ خدا تعالیٰ کیلئے گالیاں کھانا عزت ہے لیکن اپنی ذات کیلئے گالیاں کھانا کبھی ذلت کا موجب بھی ہوسکتا ہے۔ رسول کریم ﷺ کو ذاتی طور پر لوگ صادق اور امین کے نام سے یاد کیا کرتے تھے لیکن جونہی حضور نے اللہ تعالیٰ کا نام لیا لوگوں نے حضور کو کاذب کہنا شروع کر دیا۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں آنحضرت ﷺ کی طرف یہ قول نقل فرمایا کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْکُمْ عُمُرًا مِنْ قَبْلِہٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ[۱۲] یعنی دعویٰ نبوت سے قبل کیا کسی نے تم میں سے مجھے گالی دی یا کوئی اعتراض کیا؟ ہاں جونہی میں نے خدا تعالیٰ کا نام لیا تو تم نے مجھ کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔

تو یہ گالیاں وہ لوگ حضور کو نہیں دے رہے تھے بلکہ درحقیقت خدا تعالیٰ کو دے رہے تھے اور وہ اوجھڑی حضور پر نہیں پھینکی گئی تھی بلکہ دراصل خدا تعالیٰ پر پھینکی گئی تھی اور جب حضور کے گلے میں رسّی ڈالی گئی تھی تو محض محمد ﷺ کے گلے میں نہیں بلکہ اُس محمد کے گلے میں ڈالی گئی تھی جو رسول اللہ ہونے کا مدعی اور خدا تعالیٰ کا نام لینے والا تھا۔ پس یہ سلوک گویا حضورؐ سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ سے تھا۔ میرے اس فقرہ پر تعجب نہ کرو کیونکہ انسان سے بعض سلوک خدا تعالیٰ سے سلوک قرار پاتے ہیں۔ مثلاً حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے دن بعض لوگوں کو مخاطب ہو کر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میں بھوکا تھا تم نے مجھے کھانا کھلایا، میں ننگا تھا تم نے مجھے کپڑا پہنایا اس لئے تم جنت میں چلے جاؤ۔ وہ لوگ کہیں گے تُو کب ہمارے پاس بھوکا ہونے کی حالت میں آیا کہ ہم نے تجھ کو کھانا دیا یا کب ننگا ہونے کی حالت میں آیا کہ تجھ کو کپڑا دیا۔ تب اللہ تعالیٰ اُن کو فرمائے گا کہ دنیا میں میرا افلاں بندہ بھوکا اور ننگا تھا تم نے اُس کو کھانا اور کپڑا دیا تو گویا اُسے نہیں بلکہ مجھے ہی دیا۔ اسی طرح بعض لوگوں کو مخاطب ہو کر فرمائے گا کہ میں تمہارے پاس بھوکا اور ننگا ہونے کی حالت میں آیا مگر تم نے مجھے کھانا اور کپڑا نہ دیا اس لئے جہنم میں جاؤ۔ وہ لوگ کہیں گے کہ اے خدا! تُو کب ہمارے پاس اس حالت میں آیا کہ ہم نے تجھ کو کھانا اور کپڑا نہ دیا تب خدا تعالیٰ ان کو بھی یہی جواب دے گا کہ دنیا میں میرا افلاں بندہ بھوکا اور ننگا تھا لیکن تم نے اس کو کھانا اور کپڑے کی مدد نہ

دی تو گویا یہ سلوک تم نے اُس سے نہیں بلکہ مجھ سے روا رکھا[۱۳]۔

پس ان تکالیف کا نام جو خدا تعالیٰ کے راستے میں ہم کو آتی ہیں ذلت رکھنا سراسر جہالت ہے۔ اگر یہ تکالیف درحقیقت ذلت ہوتیں تو ہم کو قرآن مجید میں یہ دعا سکھلائی جاتی کہ اے خدا! لوگ ہم کو گالیاں نہ دیں، ہمارا بائیکاٹ نہ کریں۔ پس ہماری جماعت کو چاہئے کہ اس موقع پر سورۃ فاتحہ پر غور کرے کیونکہ ہر ایک وہ چیز جو خدا تعالیٰ کیلئے قربان کی جائے وہ گئی نہیں بلکہ ملی ہے اور وہ عزت ہے نہ کہ ذلت اور وہ انعام ہے کیونکہ جو چیز خدا تعالیٰ کے رستہ میں قربان کی جائے سینکڑوں گُنا ہو کر قیامت کے دن واپس ملے گی۔ اور جو لوگ دنیا کی نظروں میں ذلیل خیال کئے جاتے ہیں وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک معزز ہیں اور حقیقی عزت وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کے حضور حاصل ہو۔ دنیاوی عزتیں تو محض جھوٹ اور فریب ہیں۔ سجدہ کو دیکھو وہ بظاہر کیسی ذلت کی حالت ہے لیکن اس کے بارہ میں نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ[۱۴] سجدہ میں چونکہ زمین پر سر رکھ دیا جاتا ہے اس لئے یہ بظاہر ذلت کی صورت ہے لیکن حضور فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کیلئے نیچے کو جاتا ہے اللہ تعالیٰ اُس کو بلند کرتا ہے اور جو شخص دنیاوی نقطۂ نگاہ سے بلند ہونا چاہتا ہے خدا تعالیٰ اُس کو بلندی سے نیچے کی طرف لے جاتا ہے۔ فرعون نے ہامان سے کہا تھا کہ مجھے ایک محل بنا دو جس پر چڑھ کر میں ذرا موسیٰ کے خدا کو تو دیکھوں[۱۵]۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کے ساتھ عجیب سلوک کیا کہ اس کو بحرِ قلزم میں اپنا وجود دکھایا۔ یعنی چونکہ وہ اُوپر کو جانا چاہتا تھا خدا تعالیٰ نے کہا کہ تُو اوپر کو کیا جاتا ہے میں تم کو نیچے ہی اپنا وجود دکھا دیتا ہوں۔ پس فرعون جو اوپر کو جانا چاہتا تھا اسے خدا تعالیٰ نیچے کی طرف لے گیا۔ لیکن مؤمن خدا تعالیٰ کیلئے نیچے کی طرف جانا چاہتا ہے اسے اللہ تعالیٰ اونچا کرتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ روحانی عالم میں اللہ تعالیٰ کا سلوک بالکل اُلٹ ہوتا ہے یہ گویا خواب کا سا معاملہ ہوتا ہے جیسے خواب میں تعبیر بعض اوقات اُلٹ ہوتی ہے جیسے موت سے مراد عمر کے لمبا ہونے اور دین کی ترقی کے ہیں اور ہنسنے سے مراد رنج اور رونے سے مراد خوشی کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح جسمانی اور روحانی عالَم بعض امور میں اُلٹ چلتے ہیں۔ پس جس قدر لوگ ہم کو گالیاں دیں گے اُسی قدر ہم کو عزت ملے گی اور جس قدر ہم کو دھتکاریں گے اسی قدر اللہ تعالیٰ ہم کو اپنے

قریب کرے گا۔ دنیا دیکھ لے کہ گالیوں سے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا کیا حرج ہؤا۔ حضور کی جماعت پر ایک دن بھی ایسا نہیں آتا جس میں اُس کو ترقی حاصل نہ ہوتی ہو اور دشمنوں پر ایک دن بھی ایسا نہیں آتا جس میں اُن میں کمی نہ آتی ہو۔ تو ہمارا دشمن نقصان میں ہے نہ کہ ہم۔ گالیاں دینا تو کمزوروں کا کام ہے اور یہ کمزور لوگوں کا ہی اوچھا ہتھیار ہے گالیاں دے کر وہ گویا اپنا ناک آپ کاٹ رہے ہوتے ہیں۔

پس ہماری جماعت کو گھبرانا نہیں چاہئے تکالیف کا آنا خوشی اور فخر کا مقام ہے یہ زمانہ تلوار چلانے کا تو نہیں تھا اس لئے ہمارے دلوں میں ضرور یہ حسرت رہتی تھی کہ آنحضرت ﷺ اور دیگر انبیاء کے صحابہ کو تو تکالیف اٹھانے اور قربانیاں کرنے کی توفیق ملی مگر ہم کو یہ نعمت نصیب نہ ہوئی۔ پس ہم کو گالیاں دلا کر اور بعض دوسری مشکلات میں مبتلاء کر کے اللہ تعالیٰ نے ہماری یہ حسرت پوری کر دی۔ ہماری جماعت کو ہمیشہ یہ سوچنا چاہئے کہ صحابہؓ مصائب کو کس نگاہ سے دیکھا کرتے تھے کیونکہ ہمیں انہیں کے نقشِ قدم پر چلنے کا حکم ہے۔

میں اِس وقت ایک واقعہ بطور مثال سناتا ہوں تاریخوں میں آتا ہے ایک دفعہ رومیوں سے مسلمانوں کی جنگ ہو رہی تھی اور جنگ مبارزہ تھی یعنی دونوں طرف کے بہادر ایک ایک کر کے لڑ رہے تھے۔ اتفاقاً ایک رومی سردار نے بہت سے مسلمانوں کو مار ڈالا۔ کئی بہادروں کے مارے جانے کے بعد حضرت ضرارؓ اُس کے مقابلہ کیلئے نکلے لیکن جونہی مقابلہ شروع ہؤا آپ اپنے خیمہ کی طرف بھاگ پڑے۔ یہ دیکھ کر دشمن بہت خوش ہوئے اور مسلمان گھبرا اُٹھے کہ یہ کیا ہؤا کیونکہ ضرارؓ نہایت اعلیٰ پائے کے جرنیل تھے۔ غالباً حضرت ابوعبیدہؓ سردارِ لشکر تھے انہوں نے بھی حیرت کا اظہار کیا۔ جب ضرارؓ اپنے خیمہ میں پہنچے تو ان کی ہمشیرہ غصہ سے باہر نکل آئیں اور اُن کو ملامت کرنے لگیں۔ حضرت ضرارؓ نے کہا اصل بات یہ ہے کہ میں نے آج اتفاقاً زرہ پہنی ہوئی تھی۔ جب عیسائی جرنیل نے مجھ پر حملہ کیا تو میرے دل میں خیال پیدا ہؤا کہ ضرارؓ تُو ہمیشہ بغیر زرہ کے لڑتا رہا ہے آج جو تُو نے زرہ پہنی ہے تو کیا اس وجہ سے کہ یہ عیسائی جرنیل بہت بہادر ہے اور تُو مرنے سے ڈرتا ہے؟ یہ خیال آتے ہی مجھے خوف ہؤا کہ اگر میں آج مر گیا اور خدا تعالیٰ نے مجھ سے پوچھا کہ اے ضرارؓ! کیا تُو ہماری ملاقات سے ڈرتا تھا کہ زرہ پہن کر لڑتا تھا؟ تو میں

خدا تعالیٰ کو کیا جواب دوں گا۔ پس میں خیمہ کی طرف بھاگا تا کہ زرہ اُتار دوں اور پھر جا کر دشمن سے لڑوں۔ یہ وہ نقطہ نظر تھا جس پر صحابہؓ قائم تھے ان کے نزدیک مصائب اور قربانیاں صرف کھڑکیاں تھیں جن میں سے وہ اپنے محبوب کو جھانکتے تھے۔ غرض مؤمن خدا تعالیٰ کے راستے میں پیش آمدہ تکالیف کو انعام سمجھتا ہے اور جو ان تکالیف کو انعام نہیں سمجھتا وہ اپنے دل میں ایمان رکھتا ہی نہیں۔

پس ہماری جماعت کو چاہئے کہ وہ تکالیف اور مصائب کو اسی نقطہ نگاہ سے دیکھے یہ کہ قربِ الٰہی کے حصول کیلئے ایک ذریعہ ہیں ہم کو تو صرف گالیاں دی جاتی ہیں اور کچھ تھوڑی سی تکالیف دی گئی ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے صحابہؓ کو تو گالیاں بھی دی گئیں اور انہیں قتل بھی کیا گیا اور جلاوطن بھی کیا گیا حتّٰی کہ عورتوں تک کو شدید ابتلاؤں میں سے گزرنا پڑا۔ خود رسول کریم ﷺ کی ایک صاحبزادی جب اُن کے خاوند نے اس وجہ سے انہیں مدینہ روانہ کر دیا کہ مکہ والے ان کو تکلیف دیتے تھے ان پر بُزدل کفار نے حملہ کیا اور سواری سے گرا دیا۔ اس وقت وہ حاملہ تھیں اِسی صدمہ سے اُن کا حمل ساقط ہو گیا اور اسی تکلیف کی وجہ سے وہ آخر فوت ہو گئیں۔ پس خدا کی راہ میں تکلیف پانا عزت ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ عزت کیلئے پیدا کئے گئے تھے اگر یہ چیزیں عزت نہ ہوتیں تو آپ کو ہرگز ان باتوں سے واسطہ نہ پڑتا۔

پس ہم کو اس بات سے خوش ہونا چاہئے کہ خدا تعالیٰ نے ہم کو اس قابل سمجھا کہ ہم گالیاں کھائیں اور ہم پر پتھر برسیں۔ کشمیر کی تحریک کے موقع پر جب میں سیالکوٹ میں گیا تھا تو اس وقت میری تقریر کے موقع پر احرار نے ایک گھنٹہ پانچ منٹ تک پتھر برسائے اور گو میرا دل چاہتا تھا کہ میں بھی اس تکلیف سے حصہ لوں لیکن بہت سے دوستوں نے میرے گرد حلقہ کر لیا لیکن اللہ تعالیٰ نے میری خواہش کو پورا کرنے کیلئے تین پتھر مجھ تک پہنچا ہی دیئے۔ یہ سنگ باری ایک گھنٹہ پانچ منٹ تک ہوتی رہی اس کے بعد ڈپٹی کمشنر نے حکم دیا کہ لوگ پانچ منٹ میں چلیں جائیں ورنہ لاٹھی چارج کیا جائے گا۔ تب فوراً یہ احرار بہادر وہاں سے بھاگ گئے لیکن ایک گھنٹہ پانچ منٹ تک پتھر برستے رہے۔ اس عرصہ میں بعض رؤساء نے مجھ سے کہا بھی کہ آپ چھت کے نیچے چلے آئیں اور بعض نے لیکچر ملتوی کرنے کو کہا مگر میں نے یہی جواب دیا کہ نہ میں لیکچر ملتوی کروں گا نہ اندر

جاؤں گا کیونکہ میں ان پتھروں کے کھانے میں حقیقی خوشی اور لذت محسوس کرتا تھا۔ اور اس موقع پر ہماری جماعت کے پچیس آدمی زخمی ہوئے جن میں بعد میں ایک آدمی فوت بھی ہوگیا۔ ہم کو یہ تو نہیں چاہئے کہ ایسے مواقع ہم اللہ تعالیٰ سے طلب کریں لیکن اگر خودبخود ایسے مواقع پیش آجائیں تو گھبرانے کی بجائے خوش ہونا چاہئے۔ جو شخص خدا تعالیٰ کے لئے تکلیف اُٹھانا نعمت سمجھتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرماتا ہے۔ ماں کو دیکھ لو جب وہ بچے کو کہتی ہے کہ تجھے پھینک دوں اگر بچہ آگے سے خاموش ہو رہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مجھے یہ امر منظور ہے تو ماں اُس بچے کو گرانے کی بجائے چھاتی سے لگا لیتی اور پیار کرتی ہے۔ پس ہم کو چاہئے کہ عزت اور ذلت کا معیار وہی رکھیں جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے نہ کہ اپنی طرف سے ایک چیز کو عزت اور دوسری کو ذلت سمجھ لیں کیونکہ ہوسکتا ہے کہ جو شخص لوگوں کی ظاہر بین نظروں میں ذلیل ہو وہی شخص اللہ تعالیٰ کے نزدیک معزز ہو۔

(الفضل ۹؍اگست ۱۹۳۶ء)

---

۱ الفاتحة: ۶، ۷ ۲ النساء: ۷۰

۳ ابوداؤد کتاب الخراج فی بیان مواضع قسم الخمس (الخ)

۴ اسد الغابة جلد۳ صفحہ۱۰۹ مطبوعہ ریاض ۱۲۸۶ھ

۵ بخاری کتاب الاحکام باب قول اللہ تعالیٰ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ (الخ)

۶، ۷ تاریخ الخلفاء للسیوطی صفحہ۵۱ مطبوعہ لاہور ۱۸۹۲ء

۸ تاریخ ابن اثیر جلد۲ صفحہ ۴۲۵، ۴۲۶ مطبوعہ بیروت ۱۹۶۵ء

۹ البقرة: ۴ ۱۰ الفاتحة: ۵

۱۱ الفاتحة: ۷ ۱۲ یونس: ۱۷

۱۳ مسلم کتاب البر والصلة باب فضل عیادة المریض

۱۴ کنز العمال جلد۳ صفحہ۲۴۳۔ مطبوعہ حلب ۱۹۷۰ء

۱۵ فَاجْعَلْ لِّیْ صَرْحًا لَّعَلِّیْۤ اَطَّلِعُ اِلٰۤی اِلٰهِ مُوْسٰی (القصص: ۳۹)